افتخار ممدوٹ اور پنجاب کی سیاست (۱۹۴۷ء-۱۹۴۹ء)

ڈاکٹر فرح گل بقائی*

Iftikhar Mamdot has played a positive role in the Independence Movement of Pakistan in 1940's. He stood by the Muslims of Punjab to reach out to their cherished dream of Pakistan. However, after achieving the goal he got involved in petty politics. He did not handle the colleague's politics adroitly. Daultana-Mamdot tussle and the centre getting involved in it was uncalled for. The objective of the article is to comprehend the mistakes and emphasize on devolution of power to grass-roots level. People should not be handicapped to get their problems solved by provincial capitals or at Federal level.

The local bodies members should be in a position to solve problems like providing health and education facilities, clean drinking water, roads, streets and availability of daily utilities to the people. Pakistan has a long way to go, it must have frequent elections at different tiers of governance i.e. local, provincial, national levels (National Assembly and Senate). People representatives at every level must be made to deliver or they should be shoo-off from their public offices. In 1950s when Punjab was facing governance problem, its solution was to have elections in the province. However, the success of election is possible when election commission acts as an independent and impartial institution.

سینئر ریسرچ فیلو، قومی ادارہ برائے تحقیقِ تاریخ و ثقافت، قائد اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد۔

پاکستان کی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی تب ابتدائی سالوں کی سیاست اور اس میں ہو جانے والی کوتاہیاں ضرور زیر بحث آئیں گی۔ جب بنیادوں میں بد دیانتی، بے اصولی باتوں کے بیج بو دیئے جائیں تو غلطیوں کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ قوموں کو اپنی غلطیاں اور کوتاہیاں نظر میں رکھنی چاہیں اور کوشش کرتے رہنی چاہیے کہ ان کا مداوا کریں اور ایسی راہیں تراشتے رہیں کہ قوم اپنی حماقتوں اور بے وقوفیوں کے باوجود ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

جاگتی قومیں ہر دم اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کے لیے کمر بستہ رہتی ہیں۔ جیسے انسان بیمار ہوتا ہے تو ڈاکٹر اس کو ایسی دوائیں اور ٹانک دیتا ہے کہ کچھ دنوں میں انسان رو بصحت ہو کر پھر اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ذمہ دار افراد قوم کے ڈاکٹر کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بڑے عہدہ پر فائز ہوں یہ ڈاکٹر قوم کا ہر وہ شخص ہے جو قوم، معاشرے اور ریاست کا بھلا چاہتا ہے اور کچھ نہ کچھ بہتر کرنے کے لیے ہمت اور حوصلہ رکھتا ہو۔

بنیادیں مضبوط ہوں تو عمارت بھی مضبوط ہوتی ہے۔ پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں کی سیاست پہلے دن سے زمینداروں، وڈیروں، سرداروں اور چودھریوں کے نرغہ میں رہی۔ اس کے برعکس ہندوستان نے تو آزادی کے تھوڑے ہی عرصے میں اس کینسر کا علاج کر لیا کہ ساری ریاستوں کے جاگیرداروں کے لیے ایک خاص رقم اور خاص حد تک جائداد رکھنے کا قانون بنا ڈالا[1] اور اس سے اضافی رقم، زیور، زمین، قیمتی اشیاء جیسے سونے چاندی کے برتن، فانوس اور ایسی ہی اور چیزیں حکومت کی ملکیت بن گئیں۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ انسانوں کو غلام بنانے کا رواج ختم ہوا۔ ہر انسان کو یہ احساس ہوا کہ وہ آزاد ہے۔ وہ کسی جاگیردار کا ملازم نہیں۔ بڑے بڑے جاگیرداروں کی بھی عقل ٹھکانے آ گئی کہ وہ اپنی رعایا پر بلا وجہ کی پابندیاں نہیں لگا سکتے وہ فیصلہ کرنے والے نہیں کہ کون کتنا پڑھے۔ پڑھے بھی یا جاہل رہے۔ کس کی کس سے شادی ہو۔ کس کو انعام و اکرام سے نوازا جائے اور کس کو جیلوں میں تمام عمر کے لیے قید کر دیا جائے۔ پاکستان میں

اب بھی ایسی نجی جیلیں، قید خانے ہیں جہاں حکومت کے اہل کار عمل دخل نہیں دے سکتے اور انسانوں کے ساتھ ناروا سلوک برتا جاتا ہے۔

پنجاب کی تاریخ

رنجیت سنگھ نے پنجاب کے سرکردہ خاندانوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ ان میں ممدوٹ، خان آف قصور، نون، ٹوانہ اور ان جیسے بہت سے سرکردہ لوگوں کو پنجاب میں سکھوں کی حمایت کرنے کیلئے مختلف طریقوں سے مجبور کیا گیا۔ رنجیت سنگھ کی اس کارروائی سے مسلمان جہادی تحریک کو ضرب لگی۔ جب مسلمان حکماء خود ہی سکھ حکمران کے ساتھ ہو گئے تو جہادی قوتیں دم توڑ گئیں۔ اس حکمت عملی کو انگریزوں نے اپنایا اور مسلمان زعماء کو جاگیریں اور دولت کے نشے میں دھت کر دیا کہ مسلمان صدیوں کے لیے غلامی کا طوق ڈالے شرمندہ پھر رہے ہیں۔ سر نہیں اٹھا سکتے آنکھ ملا کر ترقی یافتہ لوگوں سے بات نہیں کر سکتے۔[۲]

تحریک پاکستان میں نواب افتخار ممدوٹ کی خدمات ۱۹۰۶ء-۱۹۶۹ء

سر شاہ نواز خان ممدوٹ کا انتقال ۸ مارچ ۱۹۴۲ء کو ہوا وہ مسلم لیگ صوبہ پنجاب کے صدر بھی تھے اس کی انتقال کے بعد اس کا بیٹا نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ صوبہ پنجاب مسلم لیگ کا سربراہ بنا تھا۔ اس نوجوان کی تعلیم بالکل واجبی تھی اور اسے سیاست کا بھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔ تاہم یہ صوبہ پنجاب مسلم لیگ کا صدر اس لیے بن گیا تھا کہ نواب شاہ نواز مرحوم کا فرزند ارجمند تھا اور اس بنا پر سر سکندر حیات خان کا منظور نظر تھا۔ گویا انہوں نے صوبائی مسلم لیگ کی صدارت پر بھی جاگیرداروں کی اجارہ داری قائم کر لی تھی۔ جناح ایسے معاملات میں مداخلت اس لیے نہیں کرتے تھے کہ یہ ان کی وسیع ترین متحدہ محاذ کی حکمت عملی کے منافی تھا۔ ان دنوں وہ سر تیج بہادر سپرو، گاندھی اور راجگوپال اچاریہ اور وائسرائے لنلتھگو کے ساتھ مرکز میں نیشنل گورنمنٹ کے قیام کے مسئلہ پر سیاسی مباحثہ میں مصروف تھے وہ ۱۹۳۷ء-۳۸ میں کانگرسی وزارتوں کے تلخ تجربے کے پیش نظر ایسی قومی حکومت کے قیام کے خلاف تھے جس میں کانگرس کی مکمل بالادستی ہو۔[۳]

آپ لاہور میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام سر شاہ نواز ممدوٹ تھا۔ جو ملکی سیاست میں بھرپور حصہ لے رہے تھے۔ ممدوٹ خاندان کا پنجاب کی سیاست میں ایک اہم مقام تھا۔ اس کے علاوہ پنجاب کی سماجی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

والد نے حسبِ دستور بیٹے کی ابتدائی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ لاہور ہی سے ہائی سکول تک تعلیم حاصل کی۔ پھر گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلہ لیا۔ بی اے وہاں سے مکمل کیا۔ نواب افتخار حسین ممدوٹ نے سب سے پہلے حیدرآباد دکن میں پولیس کے محکمہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ چونکہ ان کا گھرانہ ملکی سیاست و سیادت میں ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ اس لیے انہیں پولیس کی یہ ملازمت زیادہ دیر تک راس نہ آئی۔ لہٰذا انہوں نے پولیس کی ملازمت سے علیحدگی اختیار کر کے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ عین اسی دوران ان کے والد نواب شاہ نواز خان ممدوٹ بھی بالخصوص پنجاب کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے لگے تھے۔

جب برعظیم پاک و ہند میں تحریک خلافت اپنے عروج پر تھی تو اس دور میں نواب افتخار حسین خان ممدوٹ نے ملکی و قومی حالات کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ پنجاب میں ۱۹۲۳ء میں سر فضل حسین کی بنائی ہوئی یونینسٹ پارٹی نے بھی سیاسی حوالے سے کام شروع کر دیا تھا۔[۴]

نواب ممدوٹ کی سیاست

پنجاب میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۶ء تک یونینسٹ جماعت کو صوبے کی سیاست پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ صوبائی مسلم لیگ نے اس سیاسی ماحول میں اپنی جگہ بنا لی تھی، افتخار ممدوٹ نے دوسری سیاسی پارٹیوں سے گٹھ جوڑ کی کوشش کیں۔ ان میں کمیونسٹ پارٹی بھی شامل تھی۔ جن کی مدد سے وہ یونینسٹ جماعت کا اثر و رسوخ پنجاب میں کمزور کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کمیونسٹ پارٹی نے کبھی بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ ان کا مسلم لیگ کے ساتھ کوئی گٹھ جوڑ کبھی ہوا ان کا زیادہ قریبی تعلق سکھوں کے ساتھ رہا۔ افتخار

ممدوٹ اور ممتاز دولتانہ کو یہ احساس تھا کہ اگر وہ کمیونسٹ گروپ کو ساتھ رکھیں تو پنجاب کے دیہی حلقہ میں ان کا پیغام پہنچانے میں آسانی ہو جائے گی اور وہ اس دعوی میں حق بجانب ہو جائے گی کہ مسلم لیگ عوام کی پارٹی ہے۔ یہ جاگیرداروں اور زمینداروں کی کنیز نہیں ہے اور یوں وہ یونینسٹ پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لیے مضبوط ہو جائے گی۔ دوسری طرف کمیونیسٹ پارٹی بھی مسلم لیگ کے ساتھ گٹھ جوڑ کے لیے تیار تھی۔ کیونکہ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ مسلم لیگ کے رہنما دیہی آبادی کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں گو کہ وہ جاگیردار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آئیں اور کمیونیسٹ جماعت کے نمائندوں نے مسلمانوں کے الگ ملک کی جدوجہد کو جائز قرار دیا اور اسے ایک ترقی پسندانہ اور قومی مطالبہ قرار دیا۔

پنجاب کے ایک سرکردہ کمیونسٹ رہنما دانیال لطیفی جو ۱۹۴۴ء میں پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے آفس سیکریٹری تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کا ۱۹۴۶ء کے انتخابات کیلئے منشور تیار کیا۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے یہ منشور متفقہ طور پر منظور کیا اور اکتوبر ۱۹۴۴ء میں تمام ممبرز میں یہ منشور تقسیم کیا گیا۔ نواب ممدوٹ اور ممتاز دولتانہ کے اس منشور پر دستخط ہوئے۔

اس منشور کے ذریعے مسلمانوں یا عوام کی معاشی حالت کو بدلنے کا بیڑا اٹھایا گیا۔ اس نے لوگوں سے وعدے وعید کیے کہ نوآبادیات (Colonial) کو پسپا کیا جائے گا اور حکومت نئی اصلاحات نافذ کرے گی۔ سڑکیں بنوائی جائیں گی، نئے کارخانے لگوائے جائیں گے۔ ان اصلاحات سے کاشتکاروں کو بھی بہت فائدہ دیا جائے گا۔

اس کے علاوہ اس منشور نے اس بات پرو زور دیا کہ مسلمانوں کو اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق بھائی چارہ، اخوت مساوات کا درس عام کرنا ہے تا کہ وہ اسلامی تعلیمات کے اثر میں اپنا آپ بہتر کر سکیں۔ قرآنی تعلیمات اسلامی تاریخ اور ثقافت اسکولوں میں لازمی مضمون ہو گا۔ غیر مسلمانوں کو اجازت ہو گی کہ وہ اپنے مذہب کے لحاظ سے بچوں کو تعلیم دیں۔ غرض مسلم لیگ نے مذہب کی بنیاد پر لوگوں کو اپنے قریب لانا شروع کر دیا۔ اسلام

ایک مضبوط بنیاد تھی جس کی وجہ سے لوگ مسلم لیگ اور پاکستان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔۲۱۵ مارچ کی رات کو نواب سر شاہ نواز ممدوٹ کے گھر میں قرارداد پاکستان کا مسودہ لکھا گیا تھا جن میں قائداعظم محمد علی جناح، نواب محمد اسماعیل خان، سر سکندر حیات اور ملک برکت علی شامل تھے۔

افتخار ممدوٹ کی مسلم لیگ میں شمولیت

افتخارحسین ممدوٹ نے اپنی جوانی ہی سے مسلم لیگ اور اس کے لائحہ عمل سے اتفاق کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس دور میں پنجاب مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ سر شاہ نواز خان ممدوٹ بھی پنجاب میں سر سکندر حیات خان کے بعد قریباً سب سے اہم اور مقتدر رہنما تھے۔ سر سکندر حیات خان کو اپنی پنجابیت اور پنجابی ہونے پر بڑا فخر اور زعم تھا۔ جبکہ ممدوٹ ایسی سوچ سے ماوراء تھے۔ وہ مسلم لیگ کے لیے کام کرنا اور مسلم لیگ سے وابستہ رہنا چاہتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں جب سر سکندر حیات خان اور قائد اعظم محمد علی جناح نے ایک معاہدہ کے تحت اسمبلی کے اندر مسلم لیگ کے نمائندوں کی وافر اور مناسب تعداد شامل کی جس سے پنجاب میں صوبائی مسلم لیگ کا کردار پنجاب کی سیاست میں فعال ہو گیا۔ اس وقت ممدوٹ کی عمر صرف تیس سال تھی لیکن انہوں نے پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی سیاست، سیاست دانوں کی مصلحت انگیزیاں اور یہاں کے سیاسی حالات اور مسلم لیگ کے مقام و مرتبہ اور اس کی اہمیت کو اسی دور سے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔

جب سر شاہ نواز ممدوٹ پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے تو نواب افتخار احمد خان ممدوٹ نے بھی مسلم لیگ اور اس کی سرگرمیوں میں اہم حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ جب شاہ نواز ۱۹۴۲ء میں فوت ہوئے تو پنجاب مسلم لیگ کے صدر جناب افتخارحسین خان ممدوٹ ہی بنے تھے۔ ان پر یہ بات واضح تھی کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت صرف مسلم لیگ ہی ہے۔

یونینسٹ پارٹی مخلوط قوموں کی پارٹی تھی اس میں سکھ، ہندو اور دیگر اقلیتوں کو بھی پورا پورا حصہ اور نمائندگی دی گئی تھی اس کے برعکس آل انڈیا مسلم لیگ سو فیصد مسلمانوں کی جماعت تھی۔۷

ممدوٹ اور طالب علم

ممدوٹ کا طالبعلموں سے رابطہ قائم رہا۔ ان کی اس بات کا اندازہ تھا کہ طالب علموں کے بغیر کسی تحریک کا اپنے منطقی انجام تک پہنچنا خاصا دشوار ہے۔ ممدوٹ مسلم لیگ فیڈریشن پنجاب کے طالب علموں سے ملتے۔ اُن کی باتیں سنتے۔ قائداعظم بھی اکثر پنجاب سٹوڈنٹ فیڈریشن کے اجلاس میں ضرور شریک ہوتے۔ رہنماؤں کی کوشش یہ ہی ہوتی تھی کہ طالب علموں کو ملک کی بدلتی ہوئی صورت حال سے با خبر رکھیں۔

اسی حوالے سے یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو اسلامیہ کالج لاہور میں اجلاس منعقد ہوا۔ قائد صدارت کی کرسی پر جلوہ افروز تھے۔ اس اجلاس میں پنجاب کے سرکردہ رہنما شامل ہوئے ان میں سعداللہ خان، نوابزادہ لیاقت علی خان، چودھری خلیق الزمان، سر عبدالقادر، نواب آف ممدوٹ، ملک برکت علی، میاں بشیر احمد اور محترمہ فاطمہ جناح شامل تھیں۔ اس جلسے کی اہم بات یہ تھی کہ ان میں خواتین بھی شامل تھیں۔

امین ترین لکھتے ہیں بحوالہ سرفراز حسین مرزا، *پنجاب مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن ۱۹۳۷ء-۱۹۴۸ء*، ص۲۳۸ کہ جولائی ۱۹۴۳ء میں انہوں نے ایک مضمون اخبار میں لکھا جس کا عنوان تھا ''وہ دن جب قائد نے لیاقت علی خان کی خلاصی کرائی'' انہوں نے اس میں تحریر کیا کہ پنجاب طالب علموں کا ایک وفد دہلی آیا۔ ان کو ممدوٹ نے نامزد کیا تھا۔ مسلم لیگ کا اجلاس تھا یہ اجلاس اینگلو عربیک کالج دہلی میں منعقد ہوا تا کہ مسلم لیگ کے نمائندوں کا انتخاب ہو سکے جو آئندہ سال مسلم لیگ کی مختلف فورم پر نمائندگی کر سکیں۔

چونکہ پنجاب میں مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے اراکین نے عمدہ کام سرانجام دیا تھا اس لیے نواب ممدوٹ نے پنجاب کی نمائندگی کے لیے جن کو چنا ان میں حمید نظامی، یحییٰ بختیار،

شیخ حامد محمود، الیاس قریشی، ضیاء السلام، محمد امین ترین، سید قاسم رضوی، راجہ افتخار اللہ، غلام احمد اور دوسرے شامل تھے۔۸

پنجاب مسلم سٹوڈنٹ ورکرز نے چھ دیہاتوں کا دورہ کیا۔ یہ دیہات جلال آباد اور فیروزپور کے علاقہ میں آتے تھے۔ ان کا دورہ کامیاب رہا۔ وہاں کے لوگوں کو بہت اشتیاق تھا کہ وہ نواب ممدوٹ سے ملیں۔۹ جن کے لیے یہ طالب علم اس بات کو نشر اور عام کر رہے تھے کہ سب لوگ مسلم لیگ کو ووٹ دیں اور مسلمانوں کو یہ احساس تھا کہ ان کا ووٹ مسلم لیگ کے لیے ایک مقدس امانت ہے۔

ایک سیشن جون ۱۹۴۴ء کو منعقد ہوا۔ فرنٹیئر کے وزیر اعلیٰ سردار اورنگزیب خان نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ میری قائد اعظم اور ممدوٹ کی رضامندی سے پنجاب کے وزیر اعلی سے ملاقات ہوئی۔ مگر وہ پنجاب کے وزیراعلی کو راضی نہ کر سکے۔ سردار اورنگزیب نے کہا کہ جناح اسکندر معاہدہ ایک حقیقت ہے مگر یہ تمام آئندہ نسلوں پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔۱۰

یونیسٹ اخبار مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن اور اس کے اکابرین کے خلاف زہر اگلتے رہے۔ روزنامہ *انقلاب* مارچ ۱۷، ۱۹۴۴ء نے تنقیدی تبصرہ کرتے ہوئے مسلم لیگی طالب علموں کو مشورہ دیا کہ وہ ان خود غرض سیاست دانوں کے دام میں نہ آئے۔ یہ بات انہوں نے ممدوٹ سے منسوب کرتے ہوئے کہیں کیونکہ یونیسٹ اور ممدوٹ نے آپس میں ٹھانی ہوئی تھی۔۱۱

حمید نظامی نے قائداعظم کو ۱۹ مئی ۱۹۴۳ء کو خط لکھا۔ جس میں تحریر کیا کہ عوام الناس کی ہمدردیاں مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ لوگوں کو مخلص قیادت چاہیے۔ ہر جگہ ہمیں یہ بازگشت سنائی دی کہ درمیان کی قیادت ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں ایسے لوگوں کو اپنے درمیان کھڑا کرنا چاہیے جن پر لوگ اعتماد کر سکیں۔ نواب ممدوٹ کے بارے میں نظامی نے لکھا ''کہ آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ نوجوان ممدوٹ کی قیادت میں کام کر کے مطمئن ہیں۔ ان میں ہمت ہے اور وہ سب کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ نے

ان کے بیانات پڑھے ہونگے اور مسلم پریس اور *ایسٹرن ٹائمز* کا ردعمل بھی پڑھا ہو گا۔ انہوں نے سخت الفاظ میں ممدوٹ اور صوبائی مسلم لیگ کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''جناح اسکندر کا معاہدہ'' نہ ہوتا تو مسلم لیگ کی اسمبلی میں جماعت بھی نہ ہوتی کیونکہ صرف اس معاہدہ کی وجہ سے مسلم ممبر لجسلیٹو اسمبلی سے منسلک ہوئے ۔ حمید نظامی اس وقت طالب علم تھے ان کا نواب ممدوٹ کے ساتھ رابطہ تھا۔[۱۲]

ممدوٹ کا اِنتباہ

نواب افتخار ممدوٹ نے ۲۶ اپریل ۱۹۴۲ء اپنے سامعین سے التماس کی کہ وہ مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیں اور کانگریس اور احرار سے ہوشیار رہیں۔[۱۳] امرتسر کے ۷ جون۱۹۴۲ء مسلم لیگ کے اجلاس میں افتخار ممدوٹ نے اس بات کا افسوس کیا کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ مخالفت کی وجہ سے مسلم لیگ کے اجلاس جو بہاول پور میں منعقد ہونا تھا نہ ہو سکا۔[۱۴]

نواب افتخارحسین ممدوٹ، پروفیسر مالک عنایت اللہ، شیخ کرامت علی، نوابزادہ رشید علی خان اور میاں فیروز الدین احمد پنجاب پرونشل مسلم لیگ دفاعی کمیٹی کے ممبران تھے ۔[۱۵] قائداعظم محمد علی جناح نے یہ کمیٹی اس لیے تشکیل دی کہ وہ کانگریس کی سول نافرمانی کا کیسے تدارک کریں گے۔[۱۶]

۸ مارچ ۱۹۴۲ء کو پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے صدر نواب سر شاہنواز ممدوٹ کا حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ سر سکندر کی تجویز اور قائداعظم کی منظوری سے مرحوم کے فرزند ارجمند نواب افتخارحسین خان کو پنجاب صوبائی مسلم لیگ کا صدر بنا دیا گیا۔ نواب افتخارحسین نہایت شریف، مرنجاں مرنج، اور دوست پرور انسان تھے لیکن اس پُر آشوب زمانے میں کسی سیاسی اور عوامی جماعت کی صدارت کو رئیسوں اور نوابوں کی موروثی جاگیر بنا دینا کوئی اچھی مثال نہیں تھی۔

پنجاب صوبائی کانگرس کی صدارت پر لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر ستیہ پال، مولوی

عبدالقادر قصوری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ متمکن رہے۔ ان میں سے کوئی بھی رئیس، نواب یا راجہ نہیں تھا۔ ان میں سے ہر شخص نے سال ہا سال کانگرس کی بے لوث خدمت کی تھی۔ قید مصائب جھیلے تھے جائدادیں ضبط کرائیں اور قوم نے جب دیکھا کہ یہ سونا بھٹی میں پڑ کر کندن ہو گیا ہے تو اظہار قدر دانی کے طور پر ان لوگوں کو صوبائی کانگرس کی صدارت کا اعزاز بخشا۔ اسی طرح پنجاب میں مجلس احرار کی صدارت مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے پاس تھی جو ایک عوامی جماعت تھی جس کی صدارت علامہ اقبال اور میاں عبدالعزیز جیسے لوگوں کے پاس تھی۔

قومی روایات کا تقاضا تھا کہ مسلم لیگ کی صدارت کے لیے اس شخص کو منتخب کیا جاتا جس نے اس جماعت کی سب سے زیادہ خدمت کی تھی جس نے ہر اِبتلا اور آزمائش کے وقت اس جماعت کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ اس معیار پر ملک برکت علی، غلام رسول خاں، میاں عبدالعزیز، خلیفہ شجاع الدین وغیرہ تھے۔ مگر نواب افتخار الدین ممدوٹ جو گوشہ عافیت کی زندگی گزار رہے تھے اپنی زمینداری اور جاگیر کے معاملات میں مصروف تھے یکا یک ۱۹۴۲ء میں منظر عام پر آ گئے اور نہایت سنگین دور میں مسلم لیگ پنجاب کی باگ ڈور ان کے ہاتھ آ گئی اس میں سر سکندر حیات کی پسند نا پسند کا بھی دخل تھا اور پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی عنان کے لیے انہیں ممدوٹ پر بھروسہ تھا۔۱۷

۵ اپریل ۱۹۴۲ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں سرشاہ نواز خان ممدوٹ ان کے انتقال ان کے بیٹے افتخار ممدوٹ سے تعزیت کی گئی ان کی گراں قدر خدمات جو انہوں نے تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کے لیے سر انجام دیں ان کو سراہا گیا۔ اس اجلاس میں افتخار ممدوٹ نے مسلم لیگ کے فنڈ میں پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا۔۱۸

مئی ۱۹۴۲ء میں کرنال میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں افتخار ممدوٹ نے مسلمانوں پر زور دیا کہ مسلمان احرار اور کانگریس کی چالوں سے ہوشیار رہیں اور مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کریں۔۱۹ مسلم لیگ کے جس دھڑے کو خضر حیات خان کی اس طرح نامزدگی منظور نہیں تھی اس میں (سرشاہ نواز مرحوم کا بیٹا) نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ

اور احمد یار دولتانہ مرحوم کا بیٹا ممتاز دولتانہ اور سر سکندر حیات مرحوم کا بیٹا شوکت حیات خان زیادہ سرگرم تھے۔ جب سر سکندر کا انتقال ہوا تھا اس وقت شوکت حیات خان فوج میں ملازم تھا۔ لیکن اسے اپنے والد کی گرانقدر خدمات کے انعام کے طور پر فوج سے فارغ کر کے صوبائی وزارت کا رکن بنا دیا گیا مسلم جاگیرداروں کے اس دھڑے کی جانب سے خضر حیات خان کی مخالفت کی ایک وجہ تو جاگیرداروں کی دھڑے بندی کی سیاست میں مضمر تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس دھڑے کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ سٹیفورڈ کرپس کے دورہ ہندوستان کے بعد پنجاب اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں سیاسی ہوا کا رخ بڑی تیزی سے یونینسٹ پارٹی کے خلاف ہو رہا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں کانگرس کی پر تشدد ایجی ٹیشن کی ناکامی کے بعد صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کا سیاسی وقار بہت بلند ہو گیا تھا جگہ جگہ مسلم عوام نے خود ہی مسلم لیگ کی شاخیں قائم کر لی تھیں اور چاروں طرف سے قائداعظم زندہ باد اور 'لے کے رہیں گے پاکستان' کے نعرے سنائی دیتے تھے۔[۲۰]

عاشق حسین بٹالوی بحوالہ سید نور احمد، *مارشل لاء سے مارشل لاء* لکھتے ہیں

> ۱۹۴۳ء میں نواب افتخار ممدوٹ کے گرد اسمبلی کے مسلمان ممبروں کا ایک مختصر گروہ جمع ہو گیا جو مختلف طریقوں سے اس بات کے خلاف احتجاج کرنے لگا کہ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی ایک زندہ اور فعال جماعت کی حیثیت سے کام نہیں کرتی۔ وزیر اعظم ہر تبدیلی سے گریز کرتے تھے لہٰذا ان کے اور اس گروپ کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ قائداعظم کو یہ شکایتیں ۱۹۴۳ء میں نہیں پہنچنے لگی تھیں بلکہ سکندر جناح پیکٹ کے بعد ہی پہنچنا شروع ہو گئی تھیں اور یہ شکایتیں بھیجنے والے کون تھے؟ علامہ اقبال، ملک برکت علی، غلام رسول خاں اور عاشق حسین بٹالوی۔
>
> نواب افتخار حسین ممدوٹ کے گرد ۱۹۴۳ میں جو مختصر سا گروہ جمع ہو گیا تھا ان میں شامل تھے میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، راجہ غضنفر علی خان، سردار شوکت حیات، شیخ کرامت علی، میر مقبول محمود وغیرہ۔ مقصد صرف یہ تھا کہ خضر ٹوانہ کو گرایا جائے اور اس کام کے لیے سب سے مؤثر آسان حربہ اُس گروہ کو یہ نظر آیا کہ شور مچانا شروع کرو کہ ہائے یہ کیا ظلم ہے۔ کہ اب لجسلیٹو اسمبلی میں مسلم لیگی پارلیمنٹری پارٹی نہیں بنائی گئی۔[۲۱]

اخبار کی اہمیت اور قائداعظم

قائداعظم نے اپریل ۱۹۴۴ء میں حمید نظامی کو طلب کیا اور ان کو کہا کہ پنجاب میں ہفت روزہ کے بجائے روزنامہ اخبار لاہور سے شائع کیا جائے یہ دراصل اورینٹ اخبار جو یونینسٹ پارٹی کے رکن اور جاگیردار نواب مشتاق احمد گرمانی نے شروع کیا تھا اس کے مد مقابل مسلم لیگ کے اخبار کی ضرورت کو جانتے ہوئے کہا۔ حمید نظامی نے سرمائے کی قلت کا ذکر کیا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ روزنامہ اخبار بنا کر پنجاب میں اس کے ذریعہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی ترجمانی کرے اور نواب ممدوٹ نے اس سلسلے میں ملاقات کا انتظام کیا۔ قائداعظم کی خواہش تھی کہ مجوزہ اخبار ایک کمپنی کے زیر اہتمام شائع ہو۔ جس کے پانچ حصہ دار ہوں۔ نواب ممدوٹ، ممتاز دولتانہ، میاں بشیر احمد اور حمید نظامی۔ حمید نظامی نے تجویز فوراً منظور کر لی اور دوسرے دن اس نے اپنے ایک دوست حامد محمود کا نام پانچویں حصہ دار کے طور پر پیش کیا۔ حامد محمود ایک اگیزیکٹو انجینئر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے آسودہ حال درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب ممدوٹ نے اس نام پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وکیل محمود علی قصوری نے کاغذات تیار کیے۔ اس اثناء میں ممتاز دولتانہ نے اپنی رائے بدل لی۔ ان کا خیال تھا کہ تین جاگیر دار اس کے حصہ دار ہوں اور حمید نظامی ایک معاوضہ کے عوض تنخواہ دار ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کریں۔

حمید نظامی نے اپنی محنت اور صلاحیت سے اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ وہ علامہ اقبال کی خودی کے فلسفہ سے سرشار تھے اور انہوں نے دولتانہ کی تجویز منظور کرنے کی اجازت نہ دی۔ اڑھائی ماہ کے بعد انہوں نے اپنے دوست حامد محمود کی شراکت سے ۲۲ جولائی ۱۹۴۴ء کو اپنا ہفت روزہ جریدہ نوائے وقت کو روزنامہ بنا دیا اور اس طرح مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی موثر ترجمانی شروع ہوئی۔۲۲

نومبر ۱۹۴۴ء کے پہلے ہفتہ میں ممتاز دولتانہ نے اپنے بعض ترقی پسند احباب کی مدد سے صوبائی مسلم لیگ کا ایک منشور شائع کیا جس میں شہری آزادیوں، انتخابات میں سرکاری مداخلت کے سد باب اور ترقی پسندانہ معاشی پالیسی کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ منشور مقبول ہوا

کیونکہ اس سے مسلمانوں کے غریب اور جمہوریت پسند حلقوں کے ذہن میں مسلم لیگ کی ایک دلکش تصویر ابھری اور یہ تاثر پیدا ہوا کہ مسلم لیگ اب تعلقہ داروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور سامراج کے خطاب یافتہ پٹھوؤں کی جماعت نہیں ہے بلکہ یہ غریب اور درمیانہ طبقہ کے مفادات و حقوق کی علمبردار ہے۔

دسمبر ۱۹۴۴ء میں پنجاب صوبائی مسلم لیگ نے نئے ارکان مسلم لیگ میں شامل کرنے کی مہم شروع کی۔ مسلم لیگ کے رہنما نواب افتخار ممدوٹ، ممتاز دولتانہ، سردار شوکت حیات خان، غضنفر علی خان اور دوسروں نے پنجاب کے دور دراز علاقوں کے دورے کیے۔ لوگوں سے جگہ جگہ خطاب کیا۔ ان سے ملاقاتیں ہوئیں ان اجلاس میں اس بات کو واضح کیا گیا کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک کی کیا اہمیت ہے۔ اسلامی ریاست کے خدوخال لوگوں کو بتائے گئے۔ اس مہم سے لوگ بہت بڑی تعداد میں مسلم لیگ میں شامل ہو نے لگے۔

مسٹر جناح نے نواب آف ممدوٹ کو ۲۸ نومبر ۱۹۴۴ کو خط لکھا۔

10-Aurangzeb Road
New Delhi
Nov 28, 1944

عزیز نواب صاحب

لکھتے ہیں میں نے آپ سے شوکت حیات خان سے اور ممتاز سے یہ بحث کی کہ پنجاب کی رہبری کس کے ہاتھ میں میں ہو۔ میرا انتخاب آپ ہیں۔ آپ سے بھی اس سلسلے میں تقریباً تین گھنٹے تک مباحثہ رہا۔ پنجاب اسمبلی میں آپ نے یہ ذمہ داری سنبھالی ہے۔ آپ سے کیونکہ تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے اس لیے مسلم لیگ کے مفاد کے لیے آپ اپنا کردار ادا کریں اور مجھے امید ہے کہ مسلم لیگ کے ارکان آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔

آپکا مخلص

ایم اے جناح

افتخار حسین
نواب ممدوٹ
ممدوٹ ولاء، ڈیوس روڈ
لاہور ۲۳

۲۱ دسمبر ۱۹۴۴ء کو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا جس میں خان

افتخار حسین خان کو لیڈر منتخب کیا گیا۔ سردار شوکت حیات کو ڈپٹی لیڈر، میاں الہ یار کو چیف وہپ، میاں نور اللہ سیکریٹری اور رانا نصراللہ کو اسسٹنٹ وہپ بنایا گیا۔ ممتاز دولتانہ کو پارٹی میں کوئی عہدہ نہ ملا۔

۵ دسمبر کو مسلم طلبا نے صوبائی اسمبلی کے سامنے یونینسٹ پارٹی کے خلاف اور مسلم لیگ کے حق میں مظاہرہ کیا۔ اگرچہ ان مظاہرین کو پولیس نے فوراً ہی منتشر کر دیا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خضر وزارت کے مسلم ارکان کی وفاداری متزلزل ہو گئی اور عوام الناس میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی جدوجہد کا رخ دراصل برطانوی سامراج کے پٹھو جاگیرداروں کے خلاف ہے۔[۲۴]

انتخابات ۱۹۴۵ء-۴۶

دسمبر ۱۹۴۵ء میں منعقد ہوئے مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلمانوں کے لیے ۳۰ نشستیں مخصوص تھیں۔ اگرچہ کانگرس قومی جماعت ہونے کا دعوی کر رہی تھی، لیکن ایک بھی مسلم نشست حاصل نہ کر سکی۔ جمعیت العلماء احرار، خاکسار اور مسلم مجلس وغیرہ کا بھی کوئی اُمیدوار کامیاب نہ ہو سکا۔ مسلم لیگ کے آٹھ اُمیدوار بلا مقابلہ منتخب ہوئے تھے اور باقی ماندہ کے مد مقابل میں سے ۱۹ کی ضمانتیں بھی ضبط ہو گئیں۔ غیر مسلم حلقوں میں کانگرس کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ انتخابات کے بعد پارٹی پوزیشن درج ذیل ٹیبل میں واضح ہے۔[۲۵]

پارٹی	نشست
کانگرس	۵۷
مسلم لیگ	۳۰
آزاد	۵
اکالی سکھ	۳
یورپین	۸
کُل منتخب ارکان	**۱۰۳**

زاہد چوہدری، مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء، لاہور، ادارہ مطالعہ تاریخ، ۱۹۹۱ء، ص ۴۳۵۔

رائے شماری

یکم فروری ۱۹۴۶ء سے صوبائی قانون ساز اسمبلی کی رائے شماری شروع ہوئی، جو ۲۰ فروری تک جاری رہی۔ پنجاب قانون ساز اسمبلی کے کُل ممبران کی تعداد ایک سو پچھتر (۱۷۵) تھی۔ ۱۴ ممبر اسمبلی میں بلا مقابلہ شامل ہو گئے تھے، ان میں۹ کانگرس سے تعلق رکھتے تھے۔ ۳ یونینسٹ تھے اور ۲ مسلم لیگی تھے۔ ووٹرز نے صوبائی اسمبلی کے لیے ۱۶۱ نمائندوں کا انتخاب کرنا تھا۔ انتخابات کے لیے ۳۶۴۰ پولنگ بوتھس صوبے کے مختلف حلقوں میں قائم کیے گئے۔ شہری علاقوں میں انتخاب کے لیے صرف ایک دن، جبکہ دیہی حلقوں میں رائے شماری کے لیے دو ہفتے کا عرصہ مقرر کیا گیا۔ لاہور کے حلقہ کے لیے ۹۷ پولنگ بوتھس کا انتظام کیا گیا اور یکم فروری تا آٹھ فروری ۱۹۴۶ء تک کی تاریخ رکھی گئی۔

مسلم لیگ نے ۸۴ نشستوں پر نمائندے کھڑے کیے جبکہ یونینسٹ نے ۱۰۰، کانگرس۸۷، اکالی سکھ نے ۲۵، کمیونیسٹ ۲۴ اور احرار نے ۱۷ نشستوں کے لیے مقابلہ کیا۔ ۳۰۰ آزاد امیدواروں سمیت ۵۵۵ امیدواروں نے انتخابات میں حصہ لیا۔[۲۶]

انتخابات فروری ۱۹۴۶ء

پنجاب اسمبلی ۸۶ مسلم حلقے

نمبر	جماعت کا نام	تعداد اُمیدوار	بلا مقابلہ	مقابلہ	ضمانت ضبط	ناکام	کامیاب	تناسب
۱	مسلم لیگ	۸۵	۲	۷۱	×	۱۲	۷۳	٪۸۵
۲	یونینسٹ	۷۴	۱	۱۱	۸	۶۳	۱۲	٪۱۴
۳	کانگرس	۸	×	×	۸	۸	×	–
۴	احرار	۱۶	×	×	۶	۱۶	×	–
۵	خاکسار	۳	×	×	۳	۳	×	–
۶	آزاد	۸۳	×	۱	۷۰	۸۱	۱	٪۱.۸۶
شہری حلقے۹ + دیہات = ۷۵+خواتین =۲								

ایم بے اعوان تحریک آزادی میں پنجاب کا کردار، ۱۸۵۷ء-۱۹۴۷ء، اسلام آباد، ماڈرن بک ڈپو میلوڈی، ۱۹۹۳ء، ص۲۸۱۔

مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء

پنجاب میں مسلم لیگ کی بے مثال کامیابی کے باوجود گورنر سر برٹرنڈ گلینسی* نے لیگ اسمبلی پارٹی کے قائد نواب افتخار حسین خان ممدوٹ کو وزارت سازی کی دعوت نہ دی۔ ٹرانسفر آف پاور جلد چھ میں برٹینڈ گلانسی کا ایک خط موجود ہے جو انہوں نے ۷ مارچ ۱۹۴۶ء کو تحریر کیا ہے۔ اس خط میں موصوف لکھتے ہیں کہ افتخار ممدوٹ ان سے ملنے آئے اور وہ اس بات پر مصر ہیں کہ پنجاب میں ان کی اکثریت ہے۔[۲۷] اس کے بجائے اس نے فروری ۱۹۴۶ء میں یونینسٹ پارٹی، اکالی اور کانگرس کے گٹھ جوڑ سے اپنی وزارت بنوا دی۔ جس کی حمایت پر ایوان کے کل ۸۴ ہندو اور سکھ ارکان جمع تھے اور صرف دس گیارہ مسلمان یونینسٹ ارکان اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ ملک سر خضر حیات ٹوانہ اس وزارت کے سربراہ تھے۔ اس وزارت سازی کے سلسلہ میں کانگریس کے صدر ابو الکلام آزاد نے نہایت شرمناک کردار ادا کیا۔ وہ صوبہ کے مٹھی بھر مسلم جاگیرداروں ہندو اور سکھ فرقہ پرستوں کے ساتھ کانگریس کا گٹھ جوڑ قائم کرنے کے لیے خاص طور پر لاہور آئے تھے اور انہوں نے محض مسلم لیگ کو اقتدار سے محروم رکھنے کے لیے گورنر گلینسی سے اشتراک عمل کر کے یہ کارنامہ سر انجام دیا۔ پنڈرل مون لکھتے ہیں کہ ابوالکلام آزاد نے اپنی اس کاروائی سے پنجابی مسلمانوں کو لاحق اس خطرے کو بالکل صحیح ثابت کر دیا کہ کانگریس چند مسلمان پٹھوں کو ساتھ ملا کر پورے برصغیر میں ہندو راج قائم کرنا چاہتی ہے اگر پنجابی مسلمانوں کے کسی حلقے میں مطالبہ پاکستان کے بارے میں شک و شبہ تھا تو اسے ابوالکلام آزاد نے دور کر دیا۔[۲۸]

آین سٹیفنز (Ian Stephens) مصنف کتاب بعنوان ''پاکستان'' نے لکھا ہے کہ پنجاب میں کانگریس، یونینسٹ اور اکالی گٹھ جوڑ سے مسلم لیگیوں کو قدرتی طور پر بہت غصہ آیا تھا۔ ان کے لیے یہ بات انتہائی تکلیف دہ تھی کہ برصغیر کی تاریخ کے ایسے دور میں، جب کہ نہایت اہم سیاسی اور آئینی فیصلے ہو رہے تھے۔ انہیں پاکستان کے اہم ترین صوبے میں اقتدار سے محروم رکھا جا رہا تھا۔ یہ بات بعد ازاں صوبے کے فرقہ وارانہ تعلقات میں

کشیدگی پیدا کرنے کا موجب بنی اور بالآخر تباہ خیز ثابت ہوئی۔۲۹ اس غصے کا اظہار اپریل کے اوائل میں پورے ہندوستان کے مسلم لیگی ارکان آسمبلی کے کنونشن میں ہوا جبکہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ نے بتایا کہ کس طرح صوبے کے گورنر سر برٹرینڈ گلینسی (Bertrand Glancy) نے کانگریس کے ساتھ عملی تعاون کر کے مسلم لیگ کو صوبائی اقتدار سے محروم رکھا حالانکہ آسمبلی میں مسلم لیگ کو اکثریت کی تائید و حمایت حاصل ہو گئی تھی۔

ملک فیروز خان نون اور سردار شوکت حیات خان نے اس موقع پر بہت اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ فیروز خان نون نے کہا کہ اگر مسلمانوں سے اسی طرح بے انصافی ہوتی رہی تو وہ یہاں چنگیز خان اور ہلاکو خان سے زیادہ تباہی مچائیں گے اور سردار شوکت حیات خان نے کہا کہ پنجاب کے فوجی نسل کے مسلمان صرف حکم کے منتظر ہیں۔ اگر آپ انہیں حکم دیں تو وہ برطانوی فوج کی موجودگی اور پنجاب میں کانگرس حکومت کے باوجود آزمائشی ریہرسل دکھا دیں گے۔۳۰ لیکن مسلم لیگی لیڈروں کی انگریزوں اور کانگرس کے خلاف ان شعلہ بیانیوں کے باوجود ۱۹۴۶ء کا سارا سال صوبے میں خیریت سے گزر گیا۔

کیونکہ اقتدار سے چپکے رہنا سیاست دانوں کی ایک ہمہ گیر خصوصیت ہے، گلانسی کی اس غلط روش سے ان لوگوں کے شکوک و شبہات کو مزید تقویت ملی جو سمجھتے تھے کہ باقی ساری دنیا ان کے خلاف سازش کر رہی ہے بحران مزید گہرا ہو گیا بہت سے مفروضات خاص طور پر اس بارے میں کہ ہندوستان کی اس غیر سرزمین میں انتخابی جمہوریت کی جڑیں جمتی جا رہی ہیں اور یہ اقلیتوں کے مفادات کا پورا خیال رکھا جا رہا ہے پوری طرح غلط ثابت ہو گئے اس صورت حال سے ماحول کی تلخی اور بڑھ گئی اس کے نتیجے میں پاکستان کے لیے مسلم لیگ کا دعویٰ اور جناح کے ہاتھ مزید مضبوط ہو گئے ناکامی سے پیدا ہونے والے چڑ چڑے پن نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور دونوں فریقوں نیز دونوں پارٹیوں کے درمیان خلیج اور بھی وسیع ہو گئی۔۳۱

---

* برٹرینڈ گلانسی پنجاب کے گورنر رہے ۱۹۴۱-۴۶ء تک۔

۲۳ فروری ۱۹۴۶ء میں پنجاب اسمبلی کی نشستوں کا اعلان ہوا۔ ۸۶ میں سے ۷۹ مسلم نشستیں مسلم لیگ نے لے لیں مگر وزارتِ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے ملک خضر حیات نے بنا لی۔ ۹ مارچ ۱۹۴۶ء کو پُر امن جلوس نکالا گیا۔ ہندوؤں نے خشت باری کی۔ ایک مسلمان طالب علم محمد مالک شہید ہوا مگر خضر حکومت نے تشدد کا بازار گرم رکھا۔ نیشنل گارڈز پر پابندی اور خضر حیات نے مسلم لیگی لیڈروں کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیے۔ مسلم لیگ کے دفتر سے نواب ممدوٹ، ملک فیروز خان، سردار شوکت حیات، میاں ممتاز دولتانہ اور بیگم شاہنواز کو گرفتار کر لیا گیا۔ لاہور کی عوام سڑکوں پر آ گئی جلسے جلوسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔۳۲

ملک فیروز خان نون کی بیوی لیڈی وقار النساء نون نے مسٹر جناح کو خط لکھا جس میں انہوں نے خفگی کا اظہار کیا کہ آپ (جناح) نے ان کے خاوند فیروز خان نون پر الزام لگایا ہے کہ وہ پنجاب میں افتخار ممدوٹ کے خلاف محاذ آرائی کر رہے ہیں۔ بیگم وقارالنساء نے کہا کہ فیروز خان بمبئی میں تھے اور یہ کولو(کشمیر) سے جناح کو خط لکھ رہی تھیں۔ انہوں نے لکھا کہ اگر ان کی بے تکلفی والے خط کسی مسائل کو جنم دیں گے تو آئندہ وہ خط و کتابت سے اجتناب کریں گی۔۳۳

ایڈیٹروں کا مشترکہ مطالبہ

۹ اگست کو لاہور کے چھ مسلمان ایڈیٹروں نے ایک مشترکہ بیان میں مطالبہ کیا کہ مشرقی پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں کئی روز سے جو منظم غنڈہ گردی جاری ہے وہ اب ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ غنڈوں کے مسلح گروہ امرتسر، جالندھر، ہوشیار پور اور مشرقی پنجاب کے دوسرے اضلاع کے دیہاتی علاقوں میں سرکاری مشینری اقلیتوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت میں قطعاً ناکام رہی ہے۔ انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اپنی اولین فرصت میں یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لیں اور بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو اس قتل عام سے بچائیں۔ صوبائی مسلم لیگ کے لیڈروں سے بھی

درخواست کی گئی کہ وہ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو اس قیامت صغریٰ میں بے یارومددگار نہ چھوڑیں، انہوں نے خان افتخار حسین آف ممدوٹ سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانان پنجاب کے رہنما کی حیثیت سے مشرقی پنجاب کے ہندو اور سکھ رہنماؤں ڈاکٹر گوپی چند اور سردار سورن سنگھ کو غیر مبہم الفاظ میں تنبیہہ کر دیں کہ اگر منظم غنڈہ گردی اور شیطانی چکر کو نہ روکا گیا تو اس کا ردعمل خطرناک ہو گا اور اس کے نتائج کی ساری ذمہ داری ڈاکٹر گوپی چند، سردار سورن سنگھ اور ان کے لیڈر تارا سنگھ پر عائد ہو گی۔[۳۴]

ممتاز دولتانہ ہوائی جہاز سے بمبئی گئے تا کہ قائداعظم کو صورتحال سے آگاہ کریں۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر ممدوٹ تارا سنگھ کو منانے کی کوشش کرتے رہے۔ تا کہ فرقہ وارانہ فسادات کا خاتمہ ہو سکے اور پنجاب میں امن قائم ہو سکے۔

پنجاب میں منسٹری بنانے کی کوشش ابھی جاری تھی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو ''یوم پاکستان'' خاموشی سے منایا گیا۔ کوئی جلسے جلوس نہیں ہوئے۔ بس دعائیہ تقریب ہوئی اور ملک کی آزادی کے لیے دعائیں کی گئیں۔[۳۵]

جس دن خان افتخار حسین آف ممدوٹ نے گورنر کو یہ یقین دلایا کہ وہ صوبہ میں وزارت بنا سکتے ہیں اُسی دن لاہور میں ہندو اور سکھ لیڈروں کا ایک بہت بڑا اجتماع کپور تھلہ ہاؤس میں منعقد ہوا اس میں چودھری لہری سنگھ اور دوسرے مقررین کی زبان سے ملک خضر حیات کے خلاف کوئی لفظ نہ نکلا۔ ملک صاحب کو منصف مزاج، ایک بہت بڑا محبّ وطن اور وطن پرست ہی ظاہر کیا گیا۔ بعد ازاں ہندو اور سکھ طلبہ نے جو مظاہرے کئے ان میں یونینسٹ ممبر دریدہ ذہنی کا شکار نہیں ہوئے اگر ملک صاحب کی سازش میں شریک نہ ہوتے تو ہندو اور سکھ کھلے بندوں ان پر غداری کے الزامات عائد کرتے کیونکہ وہ ان کے اقتدار کو ختم کرنے کا موجب بنے تھے۔[۳۶]

ممدوٹ سے وزارت بنانے کا کہا گیا ہے اور ساتھ یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ہندو اور سکھ کی مدد کے بغیر وہ وزارت نہیں بنا سکتے۔ ہندو اور سکھ مخالف جماعتوں کی مدد کے بغیر حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی۔[۳۷]

آزادی کے بعد ممدوٹ کو بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مہاجرین بہت بڑی تعداد میں لاہور آئے ان کی آباد کاری ایک سنگین مسئلہ تھی۔ پھر ہندو سکھ جنہوں نے کاروبار سنبھالا ہوا تھا وہ ہندوستان ہجرت کر گئے۔ ان کے جانے سے ایک خلا پیدا ہو گیا اور حکومتی مشینری کو دوبارہ بحال کرنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔[۳۸]

آزادی کے بعد پاکستان مختلف قسم کے مسائل سے گزر رہا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ مسئلہ مسلم لیگ پنجاب کی صفوں میں نا اتفاقی اورخلفشار، ایک طبقاتی جنگ، ممدوٹ اور دولتانہ کی چپقلش۔ ایک طرف کشمیر کا مسئلہ کھڑا تھا جو پنجاب کے ساتھ منسلک تھا اور دوسری طرف پنجاب کے حکومتی ڈھانچے میں غیر سنجیدہ اور ذات سے منسلک رویئے۔

چودھری محمد علی لکھتے ہیں کہ پنجاب کا سیاسی ڈھانچہ طبقاتی کشمکش میں جکڑا ہوا تھا۔ ابھی آزادی حاصل کیے ہوئے ایک مہینہ ہی گزرا تھا پاکستان کے پاس مسائل کے انبار لگ گئے۔ مہاجرین کا مسئلہ، کشمیر کی سرحدوں کا تعین کا مسئلہ، آبی ذریعہ کا مسئلہ، ان سب مسائل کے درمیان پنجاب کی کابینہ ایک ٹیم کی حیثیت سے کام کرنے کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف زہر اگل رہی تھی۔ دولتانہ محنتی، پُر عزم، بلند حوصلہ شخص تھے۔ ممدوٹ اس کے مقابلہ میں سست، کاہل اور پر سکون رہنے والے تھے۔ یہ دونوں آپس میں تناؤ رکھتے تھے اور پنجاب مسلم لیگ کے باقی عہدیداران ان دونوں میں بٹ گئے تھے۔ یوں مسلم لیگ کابینہ میں ہی دو گروپ بن گئے۔

اپریل ۱۹۴۸ء میں قائداعظم نے ممدوٹ، دولتانہ، شوکت حیات خان کو کراچی طلب کیا تا کہ ان کو سمجھا سکیں۔ مگر لگتا یوں تھا کہ قائداعظم بھی ان کی سمجھ بوجھ سے عاجز آ گئے تھے۔ اس ملاقات کے بعد دولتانہ اور شوکت حیات نے استعفیٰ دے دیا اور ممدوٹ نے دوسری کابینہ بنائی۔ قائداعظم کے انتقال کے بعد ایک ایمرجنسی کی کیفیت تھی حکومتی مشینری میں خلل آ رہا تھا۔ ممدوٹ نے دولتانہ اور شوکت حیات کو دوبارہ اپنی کابینہ میں شامل کیا۔ ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ پنجاب کی سیاست نے اپنے تیور بدلے۔ اب ممدوٹ اور

دولتانہ میں مقابلہ ہوا۔ دولتانہ نومبر ۱۹۴۸ء میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور جنوری ۱۹۴۹ میں پنجاب کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا اور گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔۹۲-اے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ،۱۹۳۵ء کے تحت حکومت پنجاب پر الزام عائد کیا گیا کہ بدعنوانی کی وجہ سے عوام کی زندگی اجیرن کر دی گئی۔ سازشوں کی وجہ سے سرکاری عہدے دار تباہ ہو رہے تھے انتظامیہ صرف چند لوگوں کی خوشنودی کے لیے کام کر رہی تھی اور عوام کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ گورنر جنرل کے خیال میں اہم وجہ یہ ہے کہ اسمبلیوں کے ممبران اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار نہیں وہ اس حقیقت سے چشم پوشی کر رہے ہیں کہ آزادی کے بعد قوم کو ان سے کیا کیا توقعات ہیں۔[۳۹]

حسین شہید سہروردی گاندھی کے انتقال کے بعد پاکستان آ گئے یہاں انہوں نے کوشش کی کہ وہ تمام حزب اختلاف کے رہنماؤں کو جمع کریں ان میں پنجاب کے ممدوٹ بھی شامل تھے۔[۴۰] ممدوٹ ۱۹۴۷ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے۔ ان کے پاس نظم ونسق کو چلانے کا تجربہ نہ تھا اور جو مسائل ان کو درپیش تھے وہ کافی گھمبیر تھے۔ افتخارالدین مہاجرین کے وزیر تھے وہ دائیں بازو کی سیاست پر یقین رکھتے تھے انہوں نے بہت جلد اپنی وزارت سے استعفیٰ دے دیا کہ حکومت نے بڑی بڑی ریاستیں عام مہاجرین میں تقسیم نہیں کیں۔ ممتاز دولتانہ ممدوٹ کی وزارت میں سب سے ذہین وزیر تھے۔ شوکت حیات نے ۱۹۴۸ء میں استعفیٰ دیا۔ ممدوٹ کی وزارت کے خلاف بدعنوانی کے الزامات لگائے گئے تھے۔ دولتانہ نے وزیر اعظم پنجاب کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پیش کیا اور جنوری ۱۹۴۹ء میں ممدوٹ کی حکومت کو برطرف کیا گیا اور گورنر کو مرکزی حکومت نے حکم دیا کہ نئے الیکشن کا انعقاد کرے۔[۴۱]

بقول زاہد چودھری بحوالہ کتاب *جناح لیاقت تضاد* ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا۔ مشرقی پنجاب کے ۲۱ مسلمان ارکان مغربی پنجاب اسمبلی کے رکن بنا دیے گئے۔ بعض حلقوں کی طرف سے مشرقی پنجاب اسمبلی کے مسلمان ارکان کو مغربی پنجاب اسمبلی کا رکن بنا دیے جانے کی بڑی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ ۱۸ مارچ کو نوائے وقت نے

صوبائی وزارت میں توسیع کے مسئلے پرایک اداریہ لکھا جس میں اشارتاً یہ الزام عائد کیا گیا کہ نوابزادہ لیاقت علی خان کا صوبائی حلیف ممتاز دولتانہ یہ کوشش کر رہا ہے کہ انبالہ ڈویژن کے ارکان اسمبلی میں سے دو ایک کو صوبائی کابینہ میں شامل کر کے اپنی پارٹی پوزیشن کو مضبوط کیا جائے۔ انبالہ ڈویژن میں ضلع کرنال بھی تھا جہاں لیاقت علی خان کی خاندانی جاگیر تھی۔ انبالہ ڈویژن سے آئے ہوئے اکثر مہاجرین باقی مسلمانوں کے متعلق اب بھی ''پنجابی'' کا لفظ اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا وہ خود پنجابی نہیں ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ جغرافیہ تقسیم کی بنا پر وزارت میں توسیع یا اضافہ سے تفریق اور بڑھے گی اور ممکن ہے مستقل بن جائے۔ اس میں بالآخر مشرقی پنجاب اور انبالہ ڈویژن کے مہاجر مسلمانوں کا ہی نقصان ہو گا۔

مطلب یہ تھا کہ اگر نوابزادہ لیاقت علی خان نے اپنے حلیف ممتاز دولتانہ کی وساطت سے انبالہ ڈویژن کے دو ایک ''اہل زبان'' ارکانِ اسمبلی کو صوبائی کابینہ میں شامل کرنے کا اصرار کیا تو پھر پنجابی شرونزم کا جن بوتل سے نکل جائے گا۔

اس سلسلے میں دوسری تنبیہ وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ نے ۲۰ مارچ کوصوبائی اسمبلی میں کی۔ اس نے بجٹ پر نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے کہا ''ہم مرکز سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سارا بوجھ پنجاب پر نہ ڈالیں۔ ہم پر صرف اتنا بوجھ ڈالیں جتنا ہم اٹھا سکیں۔ دوسرے صوبوں کو بھی اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کرنے پر آمادہ کیجئے''۔[۴۲]

فیض احمد فیض نے رچرڈ سائمنڈ کو بتایا کہ پنجاب میں گورنر راج کو پسند کیا گیا کیونکہ افتخار ممدوٹ کی حکومت بدعنوانی میں ملوث تھی اور لوگ اس سے تنگ تھے۔ پنجاب میں ممدوٹ کی کابینہ میں نا اتفاقی تھی۔ جس کی وجہ سے ممدوٹ کو جنوری ۱۹۴۹ء میں استعفیٰ دینا پڑا۔[۴۳]

مشرقی پنجاب میں ممدوٹ علاقہ ایک بہت وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ سب زمین ممدوٹ خاندان کی تھی۔ یہ پٹھان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ممدوٹ نے کلیدی کردار ادا کیا ۱۹۴۷ء میں خضر کی کابینہ ختم کرنے میں اس تحریک کا مسلسل حصہ رہے۔ جنھوں نے خضر حکومت کے خلاف پنجاب میں جلسے جلوسوں کا اہتمام کرتے رہے۔

پنجاب کی سیاست میں تبدیلی

گورنر کی تبدیلی سے پنجاب کی سیاست میں بھی تبدیلی آئی۔ گورنر موڈی کے خلاف احتجاج کے بعد ممدوٹ گروپ اور میاں عبدالباری ایک ہو گئے تھے۔ دولتانہ کو آہستہ آہستہ یہ شکایت پیدا ہوئی کہ میاں عبدالباری غیر جانب دار نہیں رہے۔ اور صوبے میں وزیروں کے ذریعے عملاً ان کے مخالف دھڑے کی نیم حکومت قائم ہو گئی ہے۔ چنانچہ دولتانہ نے مشیروں کے تقرر کے خلاف صوبائی لیگ کے اندر محاذ بنانا شروع کر دیا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۵۰ء کو صوبائی لیگ کونسل کے ایک ہنگامہ خیز اجلاس میں انہوں نے ایک مشیر کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پاس کرا دی۔ یہ قرارداد بالواسطہ عبدالباری کے خلاف تھی۔ لہٰذا صدر صاحب نے اگلے ہی دن اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ لیگ کونسل کے آئندہ اجلاس (منعقدہ ۲۰ اگست ۱۹۵۰ء) نے ان کا استعفیٰ منظور کر کے مسٹر دولتانہ کے نامزد امیدوار صوفی عبدالحمید کو صدر چن لیا اور گورنر کے مشیر یکے بعد دیگرے اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر چلے گئے۔ اب مسلم لیگ پر دولتانہ گروپ کا پھر قبضہ ہو گیا لیکن نئے صدر صوفی عبدالحمید نے اپنی نئی مجلس عاملہ میں نواب ممدوٹ کو جگہ دی۔ اور نواب صاحب نے اس وقت اس سے انکار نہ کیا۔ ان لڑائی جھگڑوں میں ۱۹۵۱ء اور صوبائی اسمبلی کے نئے انتخابات کا زمانہ آ گیا اور صوبے کے سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کی توجہ اُس طرف منعطف ہو گئی۔[۴۴]

ممدوٹ- دولتانہ تنازع سے پنجاب پر کیا گزری

دولتانہ- ممدوٹ تنازع کا پنجاب کو بہت برا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ممبر لجسلیٹو اسمبلی صاحبان کو یکا یک اپنی طاقت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ نواب ممدوٹ کو آنکھیں دکھانے لگے۔ صبح کو دو تین ایم ایل اے جتھ بنا کر نواب صاحب سے ملتے اور مطالبہ کرتے کہ ہمارے ضلع کا ڈپٹی کمشنر یا سپرنٹنڈنٹ ہمارا مخالف ہے اس کا تبادلہ کر دیا جائے ورنہ ہم آپ کے مخالف کیمپ میں جا رہے ہیں۔ چنانچہ تار کے ذریعہ تبادلہ کا حکم جاری ہو جاتا۔ شام کو چار پانچ دوسرے ایم ایل اے نواب ممدوٹ کو پکڑ لیتے اور مطالبہ کرتے کہ تبادلے کے احکام کو

منسوخ کرو ورنہ ہم مخالف کیمپ جاتے ہیں پھر تبادلے کی منسوخی کے احکام جاری ہوتے۔ اس طرح حالات میں عجیب ابتری پیدا ہو گئی۔ اس پر چیف سیکرٹری حافظ عبدالمجیدؒ نے احتجاج کیا تو ممدوٹ صاحب کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ چیف سیکرٹری دولتانہ سے ملا ہوا ہے، سب سے پہلے اس کا تبادلہ کرو۔ سرکاری افسر بھاگے بھاگے نواب ممدوٹ کے نجی دوستوں کے پاس سفارشیں کرانے کے لیے آتے تھے اور ایم ایل اے صاحبان کو ''ٹھیک رکھنے'' کی ذمہ داری اٹھاتے تھے پنجاب کے نظم و نسق کا معیار اور افسروں کا مورال اس سے پہلے کبھی اس حد تک تباہ نہ ہوئے تھے جیسے نومبر اور دسمبر ۱۹۴۸ء کی شدید سیاسی تگ و دو کے زمانے میں ہوئے۔ لیاقت علی خان نے لاہور آ کر حالات دیکھے اور بعض لوگوں سے مشورے کیے۔ راجہ غضنفر علی خان بھی اتفاق سے اس زمانے میں چند دِنوں کے لیے لاہور آئے ہوئے تھے۔ لیاقت علی خان کی باتیں ان سے بھی ہوئیں۔

حالات کا جائزہ لے کر وزیر اعظم کو نئے انتخابات کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا چنانچہ جنوری ۱۹۴۹ء میں آپ نے آئین کی دفعہ ۹۳(الف) کے تحت وزارت اور اسمبلی کو منسوخ کر کے صوبائی نظم و نسق گورنر موڈی کے سپرد کر دیا اور نئے انتخابات کے لیے تیاری کا حکم دے دیا۔ پنجاب میں ممدوٹ کی وزارت اس طرح ختم ہوئی۔ پنجاب میں گورنر راج نفاذ ہوا۔ البتہ ممدوٹ-دولتانہ چپقلش جاری و ساری رہی۔[۴۵]

ممدوٹ کی نئی سیاسی پارٹی

۱۹۵۰ء میں دو اور نئی سیاسی پارٹیاں معرضِ وجود میں آئیں ایک میاں افتخار الدین نے (جنہیں کچھ عرصہ پہلے تادیبی کاروائی کے طور پر مسلم لیگ کی رکنیت سے خارج کر دیا گیا تھا) ''آزاد پاکستان پارٹی'' کے نام سے ستمبر ۱۹۵۰ء میں قائم کی۔ اس پارٹی کی پالیسی ان کے سوشلسٹ خیالات کی آئینہ دار تھی۔ دوسری پارٹی نواب ممدوٹ نے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں ''جناح مسلم لیگ'' کے نام سے بنائی تھی۔

جب پنجاب اسمبلی کا انتخاب قریب آیا تو ''جناح مسلم لیگ'' نے سہروردی اور پیر

مانکی شریف کی ''عوامی مسلم لیگ'' کو ساتھ ضم کر لیا اور دسمبر ۱۹۵۰ء میں نواب ممدوٹ سہروردی کے ساتھ لڑ بھڑ کر مسلم لیگ میں واپس چلے گئے اور مسٹر سہروردی نے باقی ماندہ ''عوامی مسلم لیگ'' کو مشرقی پاکستان ''عوامی لیگ'' کے ساتھ آئینی طور پر متحد کر لیا اور متحدہ پارٹی کے نام سے ''مسلم'' کا لفظ حذف کر دیا اور اس پارٹی نے ''عوامی لیگ'' کے نام سے پاکستان کی سیاست میں نمایاں کردار ادا کیا۔[۴۶]

۱۹۴۹ء اور پنجاب میں گورنر راج

مارچ ۱۹۴۹ء میں لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی سے چند اہم فیصلے کرائے جن میں وزیروں اور سرکاری افسروں کے احتساب کے ایک قانون پیروڈا (PRODA: Public and Representatives Offices Disqualification Act) کی منظوری اور آئین کے بنیادی اصول طے کرنے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر شامل تھے۔ اس کے بعد وہ بیرونِ ملک دورے پر چلے گئے۔ جب وہ واپس آئے تو پنجاب میں ایک نئی سیاسی جنگ جاری تھی۔ جس کا پس منظر بہت دلچسپ تھا۔ اس صوبے میں گورنری راج کے بعد میاں ممتاز دولتانہ نے مصالحت کنندوں کی اپیلوں کے جواب میں صوبائی لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور یہ پیش کش کی کہ وہ کسی متفق الیہ غیر جانب دار شخص کو اس عہدے پر بٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ دونوں گروپوں (دولتانہ اور ممدوٹ گروپ) کا اتفاق میاں عبدالباری پر ہو گیا اور وہ اتفاق رائے سے صوبائی لیگ کے صدر چن لیے گئے۔ ادھر گورنر موڈی نے دفعہ ۹۳ کے تحت صوبائی نظم و نسق کا چارج سنبھالنے کے بعد سرکاری افسروں کو ہدایت بھیج دی تھی کہ اب وہ اپنے کام میں کسی پارٹی کے ممبروں اور کارکنوں کا اثر قبول نہ کریں بلکہ اپنا کام بلا رو و رعایت کریں۔ افسروں نے گورنر کا اشارہ پا کر مسلم لیگ لیڈروں کی سفارشوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینکنا شروع کر دیا اور اپنے بھلے زمانے کی طرح نوکریاں، مراعات، لائسنس اور روٹ پرمٹ وغیرہ اپنی ذاتی صوابدید کے مطابق تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ میاں عبدالباری نے صوبے کا دورہ کیا تو ہر جگہ اضلاع کے مسلم لیگی لیڈروں نے ان سے شکایت کی کہ

افسروں نے ہمارا اثر و رسوخ ختم کر دیا ہے۔ مسلم لیگ کے مقامی عہدہ داروں کی اب کوئی پرسش نہیں رہی۔ اور یہ سب گورنر موڈی کی ہدایت پر ہو رہا ہے وہ اس صوبے میں لیگ کے وقار کو تباہ کر رہے ہیں۔ میاں عبدالباری یہ سن کر گورنر کے خلاف جہاد پر تُل گئے۔

گورنر نواب ممدوٹ کے خلاف PRODA کے تحت مقدمہ قائم کر رہا تھا۔

اس مہم میں ممدوٹ اور ان کے ساتھی بھی میاں عبدالباری کے ہم نوا ہو گئے۔ جب لیاقت علی خان پاکستان واپس آئے تو پنجاب مسلم لیگ کا صوبائی صدر گورنر کی برطرفی کا مطالبہ کر رہا تھا اور اس مطالبے کے حق میں سول نافرمانی کی دھمکی دے رہا تھا۔

گورنر موڈی اس کارروائی کے بعد جو میاں عبدالباری اس کے خلاف کرتے رہے تھے اس کے نامزد مشیروں کو اپنے ساتھ بٹھانا اپنی بے عزتی سمجھتے تھے۔ انہوں نے لیاقت علی خان کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا جسے وزیر اعظم نے بلا تامل منظور کر لیا اور اس کی جگہ مرکزی کابینہ کے وزیر عبدالرب نشتر کو گورنر مقرر کر دیا۔ پھر سے مراسم اچھے ہوئے تو جناح عوامی مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ عمل ۱۹۵۳ء تک قائم رہا پھر ۱۹۵۳ میں مسلم لیگ میں دوبارہ شامل ہو گئے۔

ممدوٹ اور دولتانہ کی چپقلش چلتی رہی پھر ری پبلک پارٹی سے منسلک ہوئے۔ ایوب دور میں وزیر بنے اور پھر PRODA کے تحت انہیں وزارت کے عہدے سے برطرف کیا گیا۔[۴۹]

۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں ممدوٹ کا انتقال ہوا۔

اختتامیہ

اس ساری بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پاکستان کی سیاست میں دور اندیش سیاست دانوں کی کمی رہی ہے۔ تقسیم کے بعد سیاست کے طالع آزماء ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف رہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی کی فکر کرنے کے بجائے متروکہ جائداد پر قبضہ کرنے اور اپنے اپنے عزیز رشتے

داروں کو نوازنے کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ اس کا نقصان عوام کو ہوا۔ وہ جن پر تکیہ کئے ہوئے تھے وہ رہبر تو خود رہزن نکلے۔ پاکستان کی یہ دکھ بھری داستان ہے۔ پڑھنا اور سمجھنا ان باتوں کو اس لیے ضروری ہے کہ عوام اپنے رہبروں پر نظر رکھیں ان کی حد سے بڑھتی ہوئی مراعات کا نوٹس لیں اور وہ جب بھی ووٹ مانگنے آئیں تو اپنے عوامی مسائل کا مداوا حاصل کرنے کا مطالبہ ضرور کریں جیسے صاف پانی، اسکول، تعلیمی سہولیات، صحت اور روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی ذمہ داری۔ اگر سیاست دان ان بنیادی انسانی ضروریات سے روح گردانی کرتا ہے تو اس کو رہبری کا فریضہ عنایت کرنے سے انکار کر دیں۔

عوام کو بیدار ہونا ہو گا تا کہ وہ قوموں کی صف میں اپنے لیے ایک باوقار مقام حاصل کر سکیں۔

اختتام قرآن کی اس تعلیم سے کرتے ہیں کہ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

حوالہ جات

1- www.en-wikipedia.org (Land Reforms in India)

2- Iftikhar Haider Malik, *Sikandar Hayat Khan: A Political Biography,* Islamabad, National Institute of Historical and Cultural Research, 1985, pp. 44-45.

۳- زاہد چوہدری، مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء، لاہور، ادارہ مطالعہ تاریخ، ۱۹۹۱ء، ص ۳۴۳۔

۴- محمد علی چراغ، اکابرین تحریک پاکستان، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۷۸۳۔

5- Amarjit Singh, *Punjab Divided,* Politics of the Muslim League and Partition 1935 - 1947, New Delhi, kanishka, 2006, pp. 115-116.

۶- عاشق حسین بٹالوی، ہماری قومی جدوجہد اول، دوم، سوم، چہارم۔

۷- حوالہ سابقہ، محمد علی چراغ، ص ۷۸۴۔

8- Sarfaraz Hussain Mirza, *The Punjab Muslim Student Federation,*

Islamabad, National Institute of Historical and Cultural Research, 1991, p. 238.

۹- ایضاً، ص ۳۳۴۔

۱۰- ایضاً،ص ۲۵۹۔

۱۱- ایضاً، ص ۲۴۵۔

۱۲- ایضاً، ص ۲۳۷-۲۳۶۔

13- Riaz Ahmad, (ed.), *The Punjab Muslim League 1906 - 1947,* Islamabad, National Institute of Historical and Cultural Research, 2008, p. 101.

۱۴- ایضاً، ص ۱۰۴۔

۱۵- ایضاً، ص ۱۰۵۔

۱۶- ایضاً، ۱۰۹۔

۱۷- عاشق حسین بٹالوی، *ہماری قومی جدوجہد اول، دوم، سوم، چہارم*، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ص ۶۷۸-۶۷۹۔

18- Syed Sharifuddin Pirzada, (ed.), *Foundation of Pakistan All India Muslim League 1906-1947*, Vol II, Islamabad, National Institute of Historical and Cultural Research, 2007, p. 360.

۱۹- بحوالہ سابقہ، ریاض احمد، ص ۱۰۱۔

۲۰- بحوالہ سابقہ، زاہد چودھری، *پاکستان کی سیاسی تاریخ،مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقا*، ص ۳۶۲۔

۲۱- بحوالہ سابقہ، عاشق حسین بٹالوی، *ہماری جدوجہد، اول، دوم،سوم اور چہارم*، ص ۶۳۹-۶۴۰۔

۲۲- بحوالہ سابقہ، زاہد چودھری،*مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء*، ص ۳۷۳۔

23- Amarjit Singh, *Jinnah and Punjab,* Delhi, Kanishka), 2007, pp. 81-82.

۲۴- ایضاً، ص ۳۷۴۔

25. K.K. Aziz, *Historical Handbook of Muslim India 1700 - 1947,* Vol II, (Islamabad, Vanguard, 1995), p. 437.

۲۶- بحوالہ سابقہ، سرفراز حسین مرزا، ص ۳۴۲۔

27- Nicholas Mansergh, (ed.), *The Transfer of Power 1942-47,* Vol. VI,

The Post War Phase: New Moves by the Labour Government August 1945-22 March 1946, London, Her Majesty's Stationery Office, 1976, 1976, p. 1136.

۲۸- حوالہ سابقہ، زاہد چودھری، مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء، ص ۳۸۴۔

29- Ian Stephen, *Pakistan,* Victoria Penguins Books, 1964, p. 164.

30- Syed Sharifuddin Pirzada (ed.), *Foundation of Pakistan*, Vol II, Karachi, National Publishing House, 1970, pp. 520-21.

۳۱- جس ونت سنگھ، جناح اتحاد سے تقسیم تک، نئی دہلی، ریکھا پرنٹرز پرائیویٹ لمٹیڈ،۲۰۰۹ء، ص ۲۶۵۔

۳۲- بحوالہ سابقہ، ایم جے اعوان، تحریک آزادی میں پنجاب کا کردار، ص ۲۴۶۔

33- *op.cit.*, Amarjit Singh, (ed.), *Jinnah and Punjab*, Shamsul Hasan Collection and other Documents 1944-47, New Delhi, Kanishka Publishers, 2007, p. 303.

۳۴- زاہد چودھری، پاک بھارت تنازعہ اور مسئلہ کشمیر کا آغاز، لاہور، ادارہ مطالعہ تاریخ، ۲۰۱۳ء، ص ۳۳۔

35- Riaz Ahmad, (ed.), *The Punjab Muslim League 1906 - 1947,* Secret Police Abstract, Islamabad, National Institute of Historical and Cultural Research, 2008, pp. 339-340.

۳۶- عذرا وقار، تحریک پاکستان اور نوائے وقت، منتخب مضامین، اسلام آباد، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، ۲۰۰۴ء، ص ۷۰۔

37- Chaudri Muhammad Ali, *Emergence of Pakistan*, Lahore, Service Book Club, 1988, pp. 101102.

۳۸- چودھری محمد علی، ص ۲۵۱۔

۳۹- چودھری محمد علی، ص ص ۳۶۷-۳۶۶۔

۴۰- چودھری محمد علی، ص ۳۷۱۔

41- Richard Symond, *The Making of Pakistan,* London, Faber and Faber, 1949, p. 128.

۴۲- زاہد چودھری، جناح لیاقت تضاد اور پنجابی مہاجر تضاد، لاہور، ادارہ مطالعہ تاریخ، ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۵۔

43- Richard Symond, *In the Margins of Independence*, Karachi, OUP, 2001, p. 119.

۴۴- سید نور احمد،*مارشل لاء سے مارشل لاء تک*، لاہور، ملک دین محمد اینڈ سنز،۱۹۷۰ء، ص ۳۸۱۔

۴۵- ایضاً، ص ص ۳۷۷-۳۷۶۔

۴۶- ایضاً، ص ص۳۸۷-۳۸۶۔

47- Ian Talbot, *Pakistan A Modern History*, New Delhi, Foundations, 1988, p. 438.